اردو کا مرد مجاہد: ڈاکٹر شجاعت علی سندیلوی

شاکر علی صدیقی

جامعہ ملیہ اسلامیہ، نئی دہلی۔110025، موبائل: 9891579220

(ہائے کیا لوگ تھے جو دام اجل میں آئے)

ڈاکٹر شجاعت علی سندیلوی (ستمبر ۱۹۱۶ء-دسمبر ۱۹۹۶ء) اپنے عہد کی ایک تاریخ ساز شخصیت کے حامل تھے۔ بعض لوگ دار فانی میں کچھ ایسا کر گزرتے ہیں کہ جسد خاکی تو عالم برزخ کی طرف کوچ کر جاتا ہے، لیکن ان کا فکر و عمل ''ہرگز نمیرد آں کہ دلش زندہ شد بہ عشق-ثبت ست بر جریدہ عالم دوام ما'' (حافظ) کا مصداق بن کر ہمیشہ زندہ رہتا ہے۔ انہی لوگوں میں ایک نام شجاعت علی سندیلوی کا بھی ہے، جنہوں نے تادم زیست اپنی فکر ثریا اور عمل پیہم کے انضمام سے قوم و ملت کی آبیاری کی۔ تو دوسری طرف اپنی تہذیب و ثقافت اور زبان و ادب کے اس قدر شیدائی اور محبی تھے کہ اپنے عہد کی تمام تر اردو تحریکات میں سرگرم عمل رہے۔ تدریس، تصنیف اور تالیف میں بھی گراں قدر خدمات انجام دیں۔ ان کا تدریسی عرصہ ۱۹۳۷ء تا ۱۹۷۷ء یعنی چالیس سال کو محیط ہے۔ جولائی ۱۹۳۷ء میں علی گنج کے اسکول میں تقرر ہوا؛ لیکن کچھ ہی دنوں کے بعد جیل میں قیدیوں کو پڑھانے کے لیے ان کا نام تجویز کیا گیا اور یکم جولائی ۱۹۳۸ء سے سنٹرل جیل میں قیدیوں کی تعلیم کے نگراں مقرر کر دیے گئے۔ جہاں پر انہوں نے اپنے علم اور حلم کے ذریعہ قیدیوں کو اس قدر متاثر کیا کہ وہ خونخوار قیدیوں کے محبوب استاد بن گئے۔ اپریل ۱۹۴۵ء میں بیوی کے علاج کے سلسلہ میں چھٹی منظور نہ ہونے کے باعث وہاں سے استعفیٰ دے دیا۔ کچھ ہی دنوں کے بعد انجمن اصلاح المسلمین نے یتیم بچوں کو مفت تعلیم دینے کے لیے لکھنؤ میں ایک ادارہ کھولنے کا ارادہ کیا۔ جس کی باگ ڈور کے لیے شجاعت علی صدیقی کا نام منتخب کیا گیا۔ انہوں نے اس ذمہ داری کو بخوشی قبول کیا۔ ان کی حتی المقدور کوشش وسعی اور حسن انتظام و انصرام سے یہ ادارہ درخشندہ ستارہ کی طرح بتدریج ترقی کرتا ہوا لکھنؤ کے دیگر دانش کدوں میں ممتاز ہو گیا۔ انہوں نے یہاں ۱۹۴۵ء سے ۱۹۶۱ء تک یعنی سولہ سال باقاعدہ فرائض معلّمی ادا کیے، اس کے بعد ۱۶ نومبر ۱۹۶۱ء کو بحیثیت لکچرر شعبۂ اردو لکھنؤ یونیورسٹی میں تقرر ہو گیا اور ۱۹۷۷ء تک بڑے انہماک سے منصبی ذمہ داریاں نبھا کر سبکدوش ہوئے۔ دانش گاہ کی مصروفیت کے باوجود بھی موصوف تادم مرگ انجمن اصلاح المسلمین اور ممتاز کالج کی مٹی اور اس کے پھولوں کو اپنے لہو سے سینچتے رہے، کیوں کہ انہیں اس ادارہ سے بے انتہا محبت تھی۔ یہاں تک کہ انہوں نے اپنی آخری آرام گاہ کے لیے انجمن کی ہی خاک پیوند قبول کی۔

شجاعت صاحب اپنے شاگردوں سے بڑی محبت کرتے تھے اور ان کی تعلیم و تربیت کا فریضہ اپنا اصلی مقصد حیات سمجھتے تھے۔ وہ ایک دردمند دل رکھنے والے انسان تھے، قوم کی ناگفتہ بہ حالت اور ناخواندگی سے ان کا دل تڑپتا تھا۔ اس لیے انہوں نے حتی المقدور ناخواندگی کے تدارک میں اپنی تمام تر صلاحیتوں کو بروئے کار لا کر نونہالان قوم کی تعلیم و تربیت کا منظّم لائحۂ عمل تیار کیا۔ اپنے شاگردوں کو ''میرے بیٹے'' کہہ کر مخاطب کیا کرتے تھے۔ انہوں نے ''میری روداد حیات'' کے ذیلی عنوان ''اولاد اور شاگرد'' کے ضمن میں لکھتے ہیں:

> ''اللہ کے فضل و کرم سے میری اولاد اور میرے شاگرد سب سعادت مند ہیں اور درحقیقت میرا سرمایۂ حیات یہی ہیں.... میرے ہزاروں شاگرد ملک اور بیرون ملک میں ہیں۔ میں ان کو بھی اپنی اولاد کی طرح سمجھتا ہوں۔ میری انتہائی خوش قسمتی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے لائق و فائق اولاد دی اور مطیع و فرماں بردار شاگرد دیے، جن کی بدولت میری زندگی سکون و اطمینان کے ساتھ گزر رہی ہے۔''

(میری روداد حیات: 'نیا دور'، جولائی ۱۹۹۳ء)

شجاعت علی سندیلوی مجاہد اردو کے نام سے بھی ہمیشہ یاد کیے جاتے رہیں گے۔ کیوں کہ انہوں نے اردو کی بقا اور اس کی ترویج و اشاعت کے لیے تادم زیست بے بہا قربانیاں دی ہیں۔ جس پر بزم اردو مراد آباد کی طرف سے انہیں ۱۹۸۱ء میں ''محسن اردو'' کا خطاب دیا گیا۔ ہندوستان کی آزادی کے بعد اردو کے حقوق کی بازیابی کے لیے تشکیل شدہ تمام تحریکات

سے وہ وابستہ رہے۔صدر جمہوریہ کو اردو سفر نامہ پیش کرنے کی مہم، چھٹی دہائی میں اردو محافظ دستہ کی تحریک، اردو میڈیم اسکول کے قیام کی تحریک، سہ لسانی فارمولے کے تحت سرکاری اسکولوں میں اردو پڑھانے کا مسئلہ، اردو معلمین کی تقرری کا مرحلہ، یا پھر اردو زبان کو دوسری سرکاری زبان بنانے کا مطالبہ ہو، وہ ہر جگہ پیش پیش رہے اور سرگرم کارکن کی حیثیت سے کام کرتے رہے۔ اردو تعلیم و تدریس کی راہ میں حائل رکاوٹوں کو دور کرنے میں اردو اکادمی کے پلیٹ فارم سے بھی جد و جہد کی ایک تاریخ رہی ہے، جس میں موصوف کی کوششوں اور کاوشوں کا غالب حصہ رہا ہے۔ اردو کے مقدمہ کو بہتر طور پر ارباب اقتدار کے سامنے پیش کرنے کا اقدام، نصابی کتابوں میں قابل اعتراض مواد کی نشان دہی، انہیں نصاب سے خارج کرنے اور اتفاق و یکجہتی پر مشتمل اسباق کا اضافہ کرنے کے سلسلہ میں بھی وہ بہت فعال کردار کے مالک رہے ہیں۔ اردو زبان و ادب سے عملی محبت کی جو نظیر ان کے یہاں ملتی ہے، وہ اپنی مثال آپ ہے۔ جس کی ایک مثال ان کے ایک عزیز چودھری شرف الدین کی زبان سے سنیے:

''۱۹۷۱ء میں خادم (چودھری شرف الدین) کی دولڑکیوں کی شادی تھی۔ مرحوم کو دعوت نامہ بھیجا گیا جو انگریزی زبان میں چھپا تھا۔ شجاعت صاحب دعوت میں شریک نہ ہوئے۔ میری آنکھیں مرحوم کو تلاش کرتی رہیں، شہر کی جانی مانی ہستیاں دعوت میں شریک تھیں۔ دو تین دن بعد معلوم ہوا کہ شجاعت صاحب نے اس تقریب میں شرکت نہ کرنے کا عہد کر رکھا ہے جس کا کارڈ اردو زبان میں چھپا ہوا نہ ہوگا۔''

(ممتاز کالج میگزین خصوصی شمارہ ''ڈاکٹر شجاعت علی سندیلوی'')

انھوں نے اپنی درد بھری آنکھوں سے آزادی کے بعد فسطائی قوتوں اور تنگ نظروں کو اور بھی زیادہ اردو مٹانے کے در پے دیکھا۔ اس لیے انہوں نے اردو کی ہر تحریک میں پر جوشی سے عملی حصہ لیا اور اپنی جان، اپنے مال، اپنی صلاحیت اور اپنے وقت کو اردو کی بقا کے لیے وقف کر دیا۔ وہ جس قدر اردو کے تحفظ کے لیے بے قرار اور بے چین تھے اس کا اندازہ ان کی تحریروں اور تقریروں سے بخوبی لگایا جا سکتا ہے۔ وہ اردو کے لیے بیس لاکھ دستخطوں کی مہم میں بھی شریک عمل رہے۔ انجمن ترقی اردو کی صوبائی شاخ کے بھی متحرک اور فعال کلیدی رکن رہے۔ یہی نہیں بلکہ ماہ نامہ فروغ اردو کی ادارت کے فرائض انجام دے کر متعدد مخصوص نمبر مشتہر کیے، اردو کے مسائل کو اداریہ میں ''اپنی باتیں'' کے عنوان سے پیش کیا۔

شجاعت صاحب کا یہ مشہور قول ہے کہ ''کسی قوم کو مٹانے کے لیے سب سے پہلے اس کی تہذیب مٹائی جاتی ہے اور تہذیب کو مٹانے کے لیے اس کی زبان کو مٹایا جاتا ہے اور جب تہذیب و زبان مٹ جاتی ہے تو قوم تو خود بخود مٹ جاتی ہے۔'' اس لیے ان کے نزدیک محض زبان کے مٹنے کا مسئلہ نہیں تھا بلکہ پوری قوم کے مٹنے کا خطرہ لاحق تھا۔ اس لیے انھوں نے اردو کا تحفظ اور اس کو فروغ میں جی جان سے ہر طرح کی قربانی پیش کی۔ انہوں نے اردو کے تئیں کبھی بھی مصالحت کا رویہ اختیار نہیں کیا اور نہ ہی کبھی کوئی سمجھوتہ کیا، بلکہ ہمیشہ سینہ سپر ہو کر مد مقابل سے مقابلہ کیا، کیوں کہ ان کے نزدیک یہ ایک ملک اور قوم کی بقا کا مقدس فریضہ تھا۔ جنگ آزادی میں اردو زبان و ادب اور اردو والوں کی قربانیوں کو یاد دلاتے ہوئے وہ اپنے تیسرے مجموعۂ مضامین ''فہم و بصیرت'' کے پیش لفظ میں رقم طراز ہیں:

''داغ ہائے سینہ کو تازہ رکھنے کے لیے یہ حقیقت بار بار کہنے میں کوئی مضائقہ نہیں کہ اردو ہی ملک کی وہ واحد اور مقبول زبان رہی ہے جس نے پورے ملک میں قومی یک جہتی، حب الوطنی، مشترکہ تہذیب اور حریت و انقلاب کا صور پھونکا۔ آزادی کے لیے سرفروشی کی تمنا سب کے دلوں میں اتنی شدت کے ساتھ پیدا کی کہ لوگ تلواروں کی تیزی اور بازوئے قاتل کا زور دیکھنے کے لیے سر بکف، دشمنان آزادی سے نبرد آزما ہونے لگے۔ تاریخ حریت گواہ ہے کہ انیسویں صدی سے لے کر حصول آزادی تک اسی زبان کے فرزندوں نے قید و بند کی سختیاں جھیلیں، کالے پانی کی مصیبتیں برداشت کیں اور دار و رسن کو گلے لگانے پر فخر کیا۔.... ان کو یہ وہم و گمان بھی نہیں تھا کہ ملک کی اس مفید اور مقبول زبان کو غیروں کی حکومت میں تعلیمی، معاشی، ہر اعتبار سے آزادی تھی اور قوم و ملک بنانے والی حکومت یہ جانتے ہوئے بھی کہ یہی زبان اس کو دعوت مبارزت دے رہی ہے اور اسی کے پر جوش نعروں سے قصر بکنگھم لرزہ براندام ہو رہا ہے، اس پر کسی قسم کی کوئی پابندی نہیں لگائی؛ لیکن اپنوں کی حکومت میں جمہوریت کے نام پر لسانی دیو آفتاب حریت کے طلوع ہوتے ہی اپنی پوری قوت کے ساتھ اس نام و نشان تک باقی نہ رکھنے کے در پے ہو جائے گا اور قومی یک جہتی، ملکی سالمیت، متحدہ قومیت اور مشترکہ تہذیب کی اس زندہ تابندہ زبان کو ختم کرنا ہی سب سے بڑی دیش بھکتی سمجھے گا۔''

انہوں نے اس کو محسوس کر لیا تھا کہ سماج میں لسانی تعصب صاحب اقتدار کی طرف سے پھیلایا جا رہا ہے۔ جب انہوں نے چشم دید اس واقعہ کو دیکھا کہ یوم آزادی کے موقع پر کانگریس کا پرچم لہرانے والوں نے امین الدولہ پارک میں لگے اردو کے کتبے کو اکھاڑ پھینکا جب کہ یہی لوگ اپنے کو آزادی کا مجاہد کہلانے والے تھے۔ اس واقعہ سے یقیناً جمہوریت کے خواب کا پورا وجود ہل گیا جس پر انہوں نے پوری قوت کے ساتھ انجمن ترقی اردو ہند کے پلیٹ فارم سے اردو کے اس کتبے کو دوبارہ لگانے کی جدو جہد کی۔ مزید روز نامہ ''عزائم'' کے خاص نمبر میں اردو کو ختم کرنے کی پالیسیوں کے خلاف صدائے حق بلند کی۔

موصوف نے مولوی محمد حسین شمس علوی کا قائم کردہ ادارہ فروغ اردو کا ماہ نامہ رسالہ ''فروغ اردو'' کے ادارتی گوشہ ''اپنی باتیں'' کے عنوان سے جو اداریے تحریر کیے تھے وہ ان کی جدو جہد اور اردو دوستی کا بین ثبوت ہے۔ ۱۹۶۰ء میں جب بہار یونیورسٹی کے فیصلہ کے خلاف پورے ملک میں لسانی اقلیتوں نے احتجاج کیا اور اس کے ردعمل میں ''یوم اردو'' کا انعقاد کیا گیا، جس میں اردو کی بقا اور ترویج و توسیع کے عملی اقدام کیے گئے، تو اس پورے منظر کو سامنے رکھتے ہوئے شجاعت صاحب نے فروغ اردو کے اداریہ ''اپنی باتیں'' میں محبان اردو سے یہ اپیل کی:

''ان تقاریر میں زیادہ تر زور اس پر دیا گیا کہ جمہوریۂ ہند کے دستور میں اس اردو کو نظر انداز کرنا دستور ہند کی اہانت ہے اور یہ اہانت قابل جرم ہے؛ لیکن دستور کے (۱۹۵۲ء میں) نفاذ کے بعد مسلسل نو برس محض اس لیے اس کی اہانت کی جاتی رہی ہے کہ اردو کو اس کا جائز حق نہ ملے۔ اسکول سے اس کو نکال دیا گیا، سرکاری، نیم سرکاری دفتروں، عدالتوں غرض ہر جگہ سے اس کا استعمال متروک قرار دیا گیا۔ لڑکیوں کی مادری زبان زبردستی ہندی کر دی گئی اور یہ سب جمہوریت اور انصاف اور دیش بھکتی کے نام پر ہوا۔ عہد کیجیے کہ ہم اپنی مادری زبان اردو کی توسیع و اشاعت میں سرگرم عمل رہیں گے۔ ''اردو ہماری مادری زبان ہے'' کی آواز گھر گھر پہنچائیں گے، بچہ بچہ کی زبان پر یہی الفاظ ہونا چاہیے۔ ہر گھر پر یہی لکھا ہونا چاہیے کہ ''اردو ہماری مادری زبان ہے۔''

اسی طرح لکھنؤ میں ۲۰ اکتوبر ۱۹۶۳ء کو ریاستی سہ لسانی کنونشن کا اجلاس منعقد ہوا، جس کی صدارت ہائی کورٹ کے سابق جج اور انجمن ترقی اردو لکھنؤ کے صدر پنڈت آنند نرائن ملا نے کی۔ اس جلسہ میں صوبہ کے لسانی اقلیتوں اور خاص کر اردو کی نمائندہ شخصیتوں نے پر تپاک شرکت کی۔ جس کی اہمیت و افادیت پر تبصرہ کرتے ہوئے شجاعت علی سندیلوی اپنے اداریہ میں لکھتے ہیں:

''لکھنؤ میں ایسا نمائندہ اجتماع اردو کی بڑی سے بڑی کانفرنسوں میں بھی نہیں ہوا۔ کنونشن نے صرف اردو بلکہ دوسری اقلیتی زبانوں بنگالی، پنجابی کی حق تلفیوں کے خلاف بھی آواز اٹھائی اور اس طرح اس نے تمام اقلیتی زبانوں کو یہ راستہ دکھایا کہ وہ لسانی سامراجیت کے خلاف متحد ہو کر انگریزی کے ساتھ تیسری زبان کی حیثیت سے اپنی مادری زبان لازمی طور پر پڑھائے جانے کا مطالبہ کریں..... کنونشن نے متفقہ طور پر یہ تجویز پاس کی کہ سہ لسانی فارمولے میں اردو کی تعلیم لازمی قرار دی جائے۔''

تقریباً جولائی ۱۹۶۴ء کی بات ہے کہ لسانی اقلیت کے معاون حاکم (Assistant Commissioner) نے اتر پردیش کے شہروں کا دورہ کر کے اقلیتی زبانوں کے نمائندوں کی شکایتیں سنیں۔ انجمن ترقی اردو لکھنؤ کے صدر آنند نرائن ملا اور دینی تعلیمی کونسل کے قاضی عدیل عباسی نے جملہ اراکین کے ہمراہ ان سے ملاقات کر کے عرضداشت پیش کی۔ جس کے خلاصہ کو شجاعت صاحب نے اپنے اداریہ میں پیش کر کے بڑی شدومد کے ساتھ یہ مطالبہ کیا:

''ہائی اسکول اور انٹرمیڈیٹ میں طلبہ کو یہ اختیار دیا جائے کہ وہ امتحانات کے جوابات اردو میں لکھیں اور پیشگی اجازت لینے کی شرط ختم کر دی جائے۔ جملہ نصاب کی جملہ کتابیں اردو میں شائع کی جائیں..... سہ لسانی فارمولے کے تحت مادری زبان کی تعلیم لازمی ہونا چاہیے۔ جو ذمہ دار اردو کو اس کے حق سے محروم کر رہے ہیں نہ ملک کی کوئی خدمت کر رہے ہیں نہ زبان کی۔ ان کی یہ روش قومی یکجہتی کے لیے تباہ کن ثابت ہو رہی ہے۔ دستور ہند کا مذاق بھی اڑا رہے ہیں اور اس کی ذلت و رسوائی کا بھی سبب بنے ہیں۔ جمہوریت اس آمریت کو بہت دنوں تک برداشت نہیں کر سکتی۔''

جب ۱۹۶۵ء کے شروع مہینوں میں جنوبی ہند کے لوگوں نے ہندی کی پرزور مخالفت کی تحریک چھیڑی، تو شجاعت صاحب نے اس تحریک کو ''آتش فشاں'' سے تعبیر کیا اور اسے ہندی والوں کی تنگ نظری اور جابرانہ پالیسی کا نتیجہ قرار دے کر فروغ اردو شمارہ مارچ ۱۹۶۵ء کے اداریہ میں اردو

عصبیت کے متعلق عوام کو باخبر کیا:

''اردو والوں کو یہ تلخ تجربہ مسلسل ۱۷-۱۸ برس سے ہوتا آرہا ہے کہ کس طرح اردو کو ختم کر کے ہندی کو جبریہ طور پر نافذ کیا جارہا ہے۔ پھر یہ بھی نہیں کہ اردو والوں نے ہندی کو سرکاری زبان تسلیم نہ کیا ہو یا انہوں نے اس کو پڑھنے سے انکار کر دیا ہو۔ انہوں نے جمہوری قدروں کی پوری پابندی کرتے ہوئے اور آئین وقوانین کا پورا احترام کرتے ہوئے صرف یہ مطالبہ کیا تھا کہ اردو کو یوپی، پنجاب، بہار اور دہلی میں علاقائی زبان تسلیم کیا جائے اور ملک کے دوسرے صوبوں میں جہاں اردو جاننے والوں کی معقول تعداد ہو وہاں اس کی تعلیم کا انتظام کیا جائے اور دوسرے کاموں کے لیے استعمال کرنے کا حق دیا جائے۔ اس معقول مطالبے کے لیے یوپی سے بائیس لاکھ اور بہار سے دس لاکھ نفوس کے دستخطوں پر مشتمل صدر جمہوریہ کی خدمت میں ۵۳ء، ۵۵ء اور ۱۹۵۸ء میں یادداشتیں پیش کی گئیں؛ لیکن بارہ برس گزر جانے کے باوجود لاکھوں انسانوں کی اس آئینی درخواست پر کوئی توجہ نہیں دی گئی، بلکہ ردی کی ٹوکری میں ڈال دی گئی۔''

ان کے زمانے میں اردو مخالف جتنی بھی لہریں پیدا کی گئیں اور زبان وادب کی گراں قدر خدمات کو یکسر فراموش کرنے کی در پردہ اور اعلانیہ منصوبہ بندی کی گئی، ان سب کا انہوں نے بڑی باریک بینی سے تجزیہ کیا اور اردو کے تئیں ناحق شناسی اور احسان فراموشی کی پرزور مذمت کی۔ فروغ اردو نومبر ۱۹۷۷ء کے اداریہ میں جذبات سے پُر ہو کر بڑے درد مندانہ انداز میں تحریر کرتے ہیں:

''لسانی آمریت نے جمہوریت کے نام پر اردو کو ختم کرنے کی جس طرح منظم اور مؤثر کوشش کی اور ستیہ اور اہنسا کے پجاریوں نے ''ستیہ اور اہنسا'' کو اردو کے لیے جائز سمجھا، اس سے کون نہیں واقف ہے؟ معمولی اندازہ کے مطابق اب تک کروڑوں بچے مادری زبان اردو سے محروم کر دیے گئے، لاکھوں اساتذہ پر روزگار کے دروازے بند کر دیے گئے، کروڑوں کتابوں کی طباعت واشاعت ختم ہوگئی، کتب فروش، چھاپے خانے، اردو لکھنے پڑھنے والے زیادہ تر اقتصادی بدحالی کا شکار ہو گئے، اردو جاننے والوں کے لیے ملازمت میں کوئی گنجائش نہیں رکھی گئی، تعلیم گاہوں اور دوسرے سرکاری، غیر سرکاری یا پرائیویٹ اداروں میں اردو کا چلن دیش بھکتی کے خلاف اور غداری کے مترادف سمجھا گیا۔ اردو کا استعمال عملی طور پر سب سے بڑا پاپ قرار دیا گیا۔ اردو کے لیے ناحق شناسی اور احسان فراموشی کی اس سے بڑھ کر مثال مشکل سے ملے گی۔''

انہوں نے ہمیشہ صدائے حق بلند کی اور بغیر کسی مصلحت پسندی کے اردو کے جائز حقوق کی بازیابی کے لیے حتی المقدور جہد مسلسل کرتے رہے، یہاں تک کہ بعض مسائل میں بڑی حد تک کامیابی حاصل ہوئی۔ اتر پردیش میں اردو کو دوسری سرکاری زبان بنانے کے سلسلہ میں شجاعت علی سندیلوی اپنے اداریہ میں مطالبہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''اتر پردیش میں اردو کو دوسری سرکاری زبان کا مطالبہ نہ تو نیا ہے اور نہ ناجائز، کسی جمہوری ملک میں ایک قومی زبان کو جو حقوق حاصل ہوئے ہیں، ان کی بحالی کا مطالبہ کرنا ہر شہری کا جمہوری اور دستوری حق ہے۔ البتہ ان حقوق کی پامالی وحق تلفی کرنا غیر جمہوری وغیر دستوری عمل ہے۔ اس غیر جمہوری اور غیر دستوری اور غیر منصفانہ عمل کے خلاف محبان اردو پرامن طور پر جد وجہد کر رہے ہیں اور اس وقت تک کرتے رہیں گے جب تک اردو کو اس کے جملہ وآئینی حقوق نہیں مل جاتے۔''

ہندوستان میں اردو زبان وادب کی ترویج واشاعت کے لیے سب سے پہلے اتر پردیش میں اردو اکادمی کا قیام عمل میں آیا، لیکن جب یہ اکادمی سیاست کی نذر ہو کر بدامنی کا شکار ہوئی اور بعض وزرا اور مؤثر حضرات علی الاعلان اردو کی مخالفت کرنے لگے، تو شجاعت صاحب سے رہا نہ گیا اور انہوں نے فروغ اردو مارچ ۱۹۸۴ء کے اداریہ میں حقیقت حال سے باخبر کرتے ہوئے گندی سیاست کرنے والوں کو مخاطب کر کے لکھا:

''اردو کو دوسری زبان بنانے کے سلسلہ میں حکمراں سیاسی جماعت کے جو وزرا اور بااثر حضرات علی الاعلان مخالفت کر رہے ہیں، کتابچے شائع کر رہے ہیں، ان کے خلاف اردو کے عوام اور ادارے تو تادیبی کارروائی کرنے کا مطالبہ کر رہے ہیں؛ لیکن خود کانگریس کے نہ ریاستی صدر اور نہ مرکزی صدر نے کسی قسم کی باز پرس کی، آخر ایسا کیوں؟۔''

پھر اسی اداریہ میں آگے ان نام ونمود اور دوغلی پالیسی رکھنے والے لوگوں کو جو اردو کے نام پر دم بھرتے ہیں اور اپنی ذاتی مفاد واغراض اور مالی منفعت کی تحریص سے اردو کے سوداگر ہو جاتے ہیں، ان کو جھنجھوڑتے ہوئے لکھا:

''اردو کو ختم کرنے کی ذمہ داری اردو والوں پر بھی ہے، ان کا ایک طبقہ اپنے ذاتی مفاد اور مالی منفعت کی خاطر اپنے آقاؤں کے اشاروں پر چلنے پر مجبور ہے۔ یہ حضرات اپنی سیاسی جماعت کے اغراض و مقاصد کو اردو کی فلاح و بہبود پر ترجیح دیتے ہیں۔ بظاہر اردو کے بڑے ہمدرد اور سچے خادم بنتے ہیں، جلسے اور کانفرنسیں بھی کرتے ہیں، بارگاہ حکومت میں وفود بھی لے جاتے ہیں؛ لیکن نتیجہ وہی ڈھاک کے تین پات رہتا ہے۔ ان سے کسی قسم کی امید رکھنا اپنے کو دھوکا دینا ہے۔''

اردو زبان کو فسطائی قوتوں نے ہمیشہ عصبیت کی نگاہ سے دیکھا اور اردو کشی کے لیے اشتعال انگیز بیان بازی اور شگوفہ کاری سے ملک کی سالمیت اور جمہوریت کو اس قدر نقصان پہنچایا کہ پورے ملک میں لسانی تفریق پھیل گئی، جس کے باعث آج بھی لسانی تفرقہ کی چنگاریاں اپنے گل کھلا رہی ہیں، کبھی تو اردو کے رسم الخط کو بدلنے کی بات کی جارہی ہے اور کبھی مسلمانوں کی مخصوص زبان کہہ کر مخاصمت پیدا کی جارہی ہے اور کبھی غیر ملکی زبان کا دھونس دے کر ملک بدر کرنے کی سازش رچی جارہی ہے، لیکن خدا کی شان کہ کھلتے ہیں پھول خاروں کے درمیان۔ جس قدر اور جس شدت سے اردو کو جڑ سے مٹانے کے اسباب پیدا کیے گئے، اتنی ہی شدت سے اردو نے اپنی سحرائی قوت سے ملک اور غیر ملک میں لوگوں کے قلوب کو مسخر کیا۔ ذرا تصور کیجیے کہ اگر کسی دوسری زبان سے یہی برتاؤ کیا جاتا تو اس زبان کا کیا حشر ہوتا؟۔ یقیناً شاعر نے خوب کہا:

تندیٔ باد مخالف سے نہ گھبرا اے عقاب
وہ تو چلتی ہے تجھے اونچا اڑانے کے لیے

آخر میں انہوں نے اردو دشمنی اور اس پر سیاست کرنے کی سازشوں کا باریک بینی سے تجزیہ کرکے یہ نتیجہ اخذ کیا کہ اگر ہم اردو کو زندہ رکھنا اور اسے ترقی دینا چاہتے ہیں، تو ہمیں خود ہی محتاط ہوکر اپنے پیروں پر کھڑا ہونا ہوگا۔ فروغ اردو نومبر، اکتوبر ۱۹۸۵ء کے شمارہ میں رقمطراز ہیں:

''یوپی میں اردو کا مسئلہ معلق ہے اور معلق رہے گا.... اگر ہمیں اردو کو زندہ رکھنا ہے اور ترقی دینا ہے تو خود ہمیں اپنے پیروں پر کھڑا ہونا چاہیے، ہمیں خود اردو کی تعلیم اور اس کے چلن کو عام کرنا چاہیے۔ یہ کام یقیں محکم اور عمل پیہم چاہتا ہے۔''

ڈاکٹر شجاعت علی سندیلوی کی اردو دوستی اور ان کی جہد مسلسل کو کبھی بھی زمانہ فراموش نہیں کرسکتا ہے۔ جب بھی اردو تحریک کی بات کی جائے گی تو شجاعت علی سندیلوی کا نام ضرور آئے گا، کیوں کہ انہوں نے صفحۂ قرطاس پر اپنے لہو سے فکر و عمل کی جو تحریر ثبت کی ہے وہ کبھی دھندلی نہیں پڑسکتی ہے۔ ہاں لمحۂ فکریہ ہے کہ آج جب ہر سو عواقبی پہلوؤں سے اردو زبان و ادب پر حملے تیز تر کیے جارہے ہیں، تو اس وقت ہماری ذمہ داری اور بھی زیادہ بڑھ جاتی ہے کہ ہم اپنے فکر و عمل سے اپنے اسلاف کی جد و جہد کو جلا بخشیں، تاکہ گاہے گاہے باز خواں کے ذریعہ اپنے سینے کے داغ کو زندہ رکھ سکیں اور شجاعت صاحب کا یہ قول کہ اگر ہمیں اردو کو زندہ رکھنا ہے اور اسے ارتقا کی منازل سے ہم کنار کرنا ہے تو ہمیں بہ ذات خود اس کے لیے کمر کسنا ہوگا اور دوسروں کی بیساکھی کا سہارا نہ لے کر خود اپنے پیروں کو اس لائق بنانا ہوگا کہ تعمیر نو کے جملہ مراحل بغیر کسی شگاف کے لرزہ براندام نہ ہوں اور اس بات کی اشد ضرورت ہے کہ نئی نسل کو ابتداً اردو زبان و ادب سے روشناس کرکے ان کے دلوں میں اس کی محبت اور اس کی عظمت کو بٹھایا جائے، تاکہ اردو کی بنیادوں کو مضبوط کیا جاسکے، کیوں کہ اس پہلو سے یقیناً تشفی نہیں۔ اپنے گھروں میں اردو بول چال کو عام کیا جائے۔ اردو کے رسائل و جرائد اور بچوں کی کہانیوں پر مشتمل کتابیں، نیز پند و نصائح اور تہذیبی و اخلاقی و تربیتی کتابچے منگوا کر ان میں شوق و ذوق پیدا کیا جائے، جس سے ہمارے اسلاف کی قربانیاں ضائع نہ ہوں۔

○○

سائنس کے منتخب مضامین

اس کتاب کے مصنف محمد خلیل بنیادی طور پر ایک سائنس داں۔ انھوں نے طویل عرصے تک مرکزی حکومت کے زیر انتظام شائع ہونے والے میگزین ''سائنس کی دنیا'' کی ادارت کی ہے۔ وہ اس بات سے بڑی حد تک واقف ہیں کہ بچوں کے لیے کس طرح کے سائنسی مضامین پیش کریں۔ اس کتاب میں انھوں نے سادہ اور سہل انداز میں بچوں کو سائنس کی باتیں بتائیں ہیں اور انھیں یہ سمجھایا ہے کہ سائنس کوئی مشکل موضوع نہیں ہے۔ اس کتاب میں انھوں نے ان موضوعات کو منتخب کیا ہے جو ہمارے اردگرد بکھرے ہوتے ہیں اور باتوں باتوں میں بچوں کو یہ سمجھانے کی کوشش کی ہے کہ سائنس کی ترقیات نے انسانی زندگی پر بڑا مثبت اثر ڈالا ہے اور انسانی زندگی کے اکثر شعبے سائنس کے اثرات سے خالی نہیں ہے۔ اس کتاب میں شامل بعض مضامین ایسے ہیں جو بچوں کے ساتھ بڑوں کی توجہ بھی اپنی جانب مبذول کریں گے۔

مصنف: محمد خلیل صفحات: ۸۰، قیمت: تیس روپے

ناشر: اردو اکادمی، دہلی